جناب خالد مسعود

امام فراہیؒ کے نزدیک حکمت کا مفہوم

حکمت کا لفظ دانائی کی باتوں کے لیے ایک معروف لفظ ہے اور نہایت کثیرالاستعمال ہے لیکن مختلف علوم کے ماہرین اور اہلِ لغت اس کی تعبیر اتنے مختلف طریقوں سے کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک عام لفظ کے اندر کتنا جہانِ معانی آباد ہے۔ اہلِ فلسفہ اور صوفیاء اپنی کاوشوں کو حکمت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اہلِ لغت اس کا مفہوم کچھ اور بیان کرتے ہیں اور اہلِ تاویل کے مابین قرآن کے اندر لفظ حکمت کے معانی کے تعین میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں یوں تو لفظ حکمت متعدد مقامات پر آیا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی کے بیان میں تعلیم حکمت کی تکرار اس قدر نمایاں ہے کہ آدمی اس کی اہمیت سے صَرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ قرآن مجید کے ایک طالب علم کے لیے حکمت کے مفہوم کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔

امام حمیدالدین فراہیؒ کا موضوع فکر قرآن حکیم تھا، اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر تھی اور کسی بھی اہم لفظ یا مضمون پر سے وہ بلا تحقیق گزر جانے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے لفظ حکمت کی اہمیت کے پیش نظر اس کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس کی لغوی تحقیق ان کی کتاب 'مفردات القرآن' میں ہے جب کہ قرآن مجید میں اس لفظ کے استعمال پر انھوں نے اپنی ایک مستقل تصنیف 'حکمۃ القرآن' میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ امام فراہیؒ کے نتائج تحقیق نہایت وقیع، فکر آفریں اور قرآنی مباحث کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

لفظ حکمت مادہ ح ک م سے مشتق ہے۔ اسی مادہ سے دوسرا اسم حُکم ہے۔ لسان العرب میں حُکم کے معنی العلم والفقہ والقضاء بالعدل یعنی علم، سوجھ بوجھ اور عدل کے مطابق فیصلہ کے آئے ہیں۔ تاج العروس میں اس کے معنی ہیں القضاء فی الشیٔ یعنی کسی معاملہ کا

فیصلہ کرنا۔ اس میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک اس لفظ کا اطلاق صرف اس فیصلہ پر ہوتا ہے جو عدل کے ساتھ کیا جائے۔ امام فراہیؒ کے نزدیک الفاظ کے لغوی معانی کے تعین کے لیے مرجع کی بہترین کتاب خود قرآن مجید ہے۔ اس کے استعمالات کی روشنی میں انھوں نے لفظ حکم کا اطلاق محض فیصلہ کرنے پر کیا ہے، خواہ یہ فیصلہ حق ہو یا باطل۔ اس معنی کے لیے ان کی رہنمائی جن آیات سے ہوئی وہ یہ ہیں:

ما لکم کیف تحکمون۔ (القلم ۳۶)	تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟
أفحکم الجاھلیة یبغون۔ (مائدہ ۵۰)	کیا وہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں؟

اول الذکر آیت مشرکین کی اس غلط رائے پر تعجب کا اظہار کرتی ہے جو وہ آخرت کے بارے میں ظاہر کرتے تھے۔ موخر الذکر آیت میں جاہلیت پر مبنی فیصلہ پر لفظ حکم کا اطلاق کیا ہے۔ یہ فیصلہ ظاہر ہے حق کے مطابق نہ تھا۔ امام فراہیؒ کے نزدیک لفظ کا مفہوم یہی تھا لیکن پھر اس کا اطلاق اس قوت پر بھی ہونے لگا جس کی بدولت آدمی فیصلے کرتا ہے۔

لفظ حکمة بھی مادہ ح ک م سے اسم ہے جس کے معنی لسان العرب میں معرفة افضل الاشیاء بافضل العلوم کے آئے ہیں یعنی اعلیٰ چیزوں کی پہچان بہترین علوم کے ذریعے ہونا۔ دوسرے معنی عدل کے بتائے گئے ہیں۔ تاج العروس میں اس سے مراد العلم بحقائق الاشیاء علی ماھی علیہ والعمل بمقتضاھا یعنی اشیاء کی حقیقت کو ان کی اصلیت کے مطابق جاننا اور اس علم کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا ہے۔ حق کو علم وعمل دونوں کے لحاظ سے درست قرار دینا اور عدل سے فیصلہ کرنا بھی حکمت قرار دیا گیا ہے۔ جرجانی کے نزدیک ہر وہ بات جو حق کے موافق ہو حکمت کہلاتی ہے اور اس لفظ کا اطلاق اس علم پر بھی ہوتا ہے جس کے ساتھ عمل پایا جائے۔ راغب اصفہانی علم اور عقل سے حق کی مطابقت کو حکمت قرار دیتے ہیں۔ امام رازی نے اس کی تعبیر قول وعمل کی درستی اور ہر شے کو اس کا مقام دینے سے کی ہے۔ امام فراہیؒ نے لفظ کے معانی کا تعین اولاً اہل عرب کے استعمالات

کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اہل عرب حکمت کا اطلاق اس قوت پر کرتے تھے جو عقل ورائے کی درستی اور اس سے پیدا ہونے والی اخلاقی شرافت کی جامع ہو۔ اسی لیے وہ ایک دانش مند اور مہذب آدمی کو حکیم کہتے تھے۔ لہذا امام فراہیؒ نے حکمت کی تعبیر اس قوت سے کی ہے جس کے باعث آدمی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس قوت کے اثرات کلام کی حقانیت، اخلاق کی پاکیزگی اور حسن ادب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ثانیاً امام فراہیؒ کے پیش نظر قرآن مجید کی وہ آیات بھی ہیں جن میں حکمت کے معانی کا تعین کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا:

واتیناہ الحکمة وفصل الخطاب۔ (ص ۲۰)	ہم نے اس کو حکمت اور معاملات کے فیصلہ کی صلاحیت عطا کی۔

مولانا فراہیؒ کے نزدیک فصل الخطاب میں حکمت کا ایک اثر یہ بیان ہوا ہے یعنی جہاں حکمت موجود ہوتی ہے وہاں حق پر مبنی دو ٹوک بات کہی جاتی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں بعض اخلاقی ہدایات دینے کے بعد فرمایا گیا ہے:

ذٰلک مما اوحی الیک ربک من الحکمة۔ (۳۹)	یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمھارے رب نے حکمت میں سے تمھاری طرف وحی کی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ کردار بھی حکمت ہی کا ایک پرتو ہے۔ ان آیات کی روشنی میں امام فراہیؒ کی بتائی ہوئی حکمت کی تعریف کی تائید ہوتی ہے۔

مولانا نے حکمت کی بعض خصوصیات بیان کر کے اس کے تصور کو قریب الفہم بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حکمت کی بات عقل و دل کے نزدیک نہایت بدیہی اور واضح ہوتی ہے۔ یہ اس قدر دل میں اتر جانے والی ہوتی ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے مزید دلائل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ حکمت ایک نور ہے۔ جس طرح روشنی سے ارد گرد کی تمام چیزیں جگمگا اٹھتی ہیں اسی طرح حکمت کے نور سے آدمی کا علم منور ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح آگ کا اثر حرارت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ہر شخص اس کو محسوس کر لیتا ہے، اسی طرح حکمت بھی اپنے اثرات سے

پہچانی جاتی ہے۔ جب یہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر حق شناسی کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی ہے حق نکلتی ہے اور اس سے جو فعل صادر ہوتا ہے ٹھیک صادر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حکیم آدمی کا دل اپنے اندر رفعت محسوس کرتا ہے، اس کا کلام نہایت دل نشیں ہوتا ہے، اس کا عمل نیکی پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ اخلاق کا مجسمہ ہوتا ہے۔

لوگوں میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اہل فلسفہ حکمت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کو حکیم کہا بھی جاتا ہے لیکن امام فراہیؒ اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک فلسفیوں نے علم اور عالم کو موضوع فکر تو ضرور بنایا لیکن بالعموم ان کے فکر کی کوئی مضبوط اساس نہ تھی۔ وہ اوہام کا شکار رہے اور علم کے اصل سرچشموں تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ ارسطو تمام علوم کا احاطہ کر لینے کو حکمت کا نام دیتا تھا حالانکہ علوم کا احاطہ کسی بھی انسان کے بس میں نہیں۔ اس مخمصہ سے نکلنے کے لیے اس نے علم کو کلیات کے علم تک محدود کرنے کی کوشش کی اور مابعد الطبیعیات کے علم کو اعلیٰ حکمت قرار دیا لیکن اس کے باوجود وہ ابتدائی وہم سے نہ نکل سکا۔ امام فراہیؒ عام علوم کو حکمت کا موضوع سمجھتے ہی نہیں۔ اس لیے مسلمان فلسفیوں، اخوان الصفا، ابن سینا، الفارابی، الخوارزمی، الغزالی اور ابن خلدون کی علوم کی وہ تقسیم جس میں وہ پائیدار علوم کو حکمت کا نام دیتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔

امام فراہیؒ کے نزدیک ایک حکیم کے اندر حق کی جستجو کا مادہ اور جانچ پرکھ کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ باطل میں سے حق کو چھانٹ لیتا ہے۔ حق میں جو نورانیت ہوتی ہے اس کو حکیم کی فطرت کی بصیرت فوراً محسوس کر لیتی ہے۔ چونکہ اس کائنات کا سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر بندے کا ایمان لانا ہے اس لیے مولانا فراہیؒ کے نزدیک ایک حکیم کی پہلی شناخت اس کا ایمان ہے۔ وہ اس حق کو پہچانے، اس پر اس کا دل مطمئن ہو جائے، وہ ہر باطل سے دست کش ہو جائے اور عمل صالح کو اختیار کر لے تو وہ بلاشبہ ایک حکیم ہے۔ اگر وہ ایمان تک نہ پہنچ سکا تو دوسرے علوم و فنون میں اس کی مہارت کی بدولت اس کو حکیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سلف صالحین کے دور میں حکمت کے قرآنی مفہوم کے تعین میں اختلاف واقع ہوا ہے جس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں ملتی ہے۔ امام فراہیؒ کے پیش نظر یہ اختلاف تھا اور انھوں نے اس کو رفع کرنے کی نہایت عمدہ کوشش کی ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ امام مالک اور ابو رزین کی رائے میں حکمت سے مراد دین کی سوجھ بوجھ اور ایسا فہم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہوتا ہے۔ مجاہد نے اس کو قرآن کے فہم کے لیے مخصوص کیا ہے۔ یحییٰ بن معاذ کی رائے میں حکمت اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جس کو وہ عارفین کے دلوں کی طرف بھیجتا ہے تاکہ ان پر دنیا کے مضر اثرات کا ازالہ کرے۔ ابن زید کے نزدیک ہر وہ بات حکمت کی بات ہے جو آدمی کو تنبیہ کرے، اس کو کسی نیکی کی طرف بلائے یا کسی برے کام سے روکے۔ ابو جعفر محمد بن یعقوب ہر اس بات کو حکمت قرار دیتے ہیں جس سے صحیح فعل پیدا ہو۔ مقاتل کی رائے میں علم اور اس کے مطابق عمل کا نام حکمت ہے۔ امام فراہیؒ نے ان تمام اقوال کا حوالہ دے کر ان کو ایک ہی حقیقت کی مختلف انداز سے ترجمانی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک حکمت سب سے پہلے انسان کے دل میں بطور بصیرت و توفیق ظاہر ہوتی ہے۔ دل منور ہوتا ہے تو اس کا اثر کلام پر پڑتا ہے۔ چنانچہ حکمت کا اظہار انسان کے کلام سے ہونے لگتا ہے۔ وہ حق بات کہتا ہے، نیکی کی تعلیم دیتا ہے اور بدی سے روکتا ہے۔ اس کے بعد حکمت انسان کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ اخلاق فاضلہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح اس کے علم اور عمل میں کامل مطابقت ہو جاتی ہے۔ امام فراہیؒ کی اس تقریر کی روشنی میں مالک، ابو رزین، مجاہد اور یحییٰ بن معاذ حکمت کے اولین مقام دل کے حوالے سے اس کی وضاحت کرتے ہیں، ابن زید اور محمد بن یعقوب نے کلام میں اس کے اثر کو نمایاں کیا ہے اور مقاتل نے علم و عمل دونوں میں حکمت کے اثرات کا حوالہ دیا ہے۔

حکمت اور سنتِ رسولؐ

قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کے ضمن میں تعلیم کتاب و حکمت کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ اس کی تفسیر میں تعلیم کتاب کے لیے بالعموم مفسرین کا ذہن قرآن مجید

کی طرف گیا ہے لیکن تعلیم حکمت کے لیے وہ کسی بات پر اتفاق نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ جن میں امام شافعیؒ سر فہرست ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہاں حکمت سے مراد سنت رسول اللہؐ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب کتاب اور حکمت کے الفاظ ساتھ ساتھ آرہے ہیں تو لازم ہے کہ ان سے دو مختلف چیزیں مراد لی جائیں۔ چونکہ رسول اللہؐ کی اطاعت اور آپ کے احکام کی اتباع فرض ہے، اس لیے آنحضرتؐ کی سنت ہی ایسی چیز ہو سکتی ہے جس کا ذکر کتاب اللہ کے ساتھ کیا جائے۔ لہٰذا حکمت سے مراد سنت رسول اللہؐ ہے۔ امام فراہیؒ نے اس نقطہ نظر سے اختلاف کیا ہے اور اس کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی دو آیات ایسی پیش کی ہیں جس میں کتاب اور حکمت کے الفاظ ایک ساتھ آئے ہیں لیکن وہاں حکمت سے مراد سنت کو ہرگز نہیں لیا جاسکتا۔ وہ آیات یوں ہیں:

وانزل الله علیك الکتاب	اور اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل
والحکمة وعلمك مالم تکن	فرمائی اور تمھیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں
تعلم۔ (النساء۔۱۱۳)	جانتے تھے۔
واذکرن مایتلی فی بیوتکن	اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات
من آیات الله والحکمة۔	اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا
(الاحزاب۔۳۴)	چرچا کرو۔

ان آیات میں حکمت کے لیے فعل انزل اور یتلی استعمال ہوئے ہیں جو قرآن میں صرف وحی آسمانی کے لیے آئے ہیں۔ آنحضرتؐ پر وحی نازل ہوئی اور اسی کی تلاوت آپ کی ازواج مطہرات کے گھروں میں ہوا کرتی تھی۔ یہ دونوں فعل کہیں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وافعال کے لیے استعمال نہیں ہوئے۔

مولانا فراہیؒ کا مزید استدلال یہ ہے کہ حدیث رسولؐ دانش و موعظت کے مضامین کے لیے خاص نہیں، بلکہ احکام شریعت کی حامل بھی ہو سکتی ہے۔ اگر اس کا تعلق قانون سے ہو تو اس صورت میں اس پر حکمت کے لفظ کا اطلاق بالکل نامناسب ہوگا۔ مزید برآں قرآن مجید نے اپنی تعلیم کے اندر پائے جانے والے اصول دین کو سورۂ بنی اسرائیل آیت ۳۹ میں خود حکمت سے

سے موسوم کیا ہے، لہٰذا یہ ہرگز ضروری نہیں کہ حکمت قرآن سے باہر کی کوئی چیز سمجھی جائے۔ مولانا کے نزدیک کتاب سے قرآن مجید کے ایک ضابطۂ شریعت ہونے کا مفہوم نکلتا ہے اور حکمت یہ اس اعتبار سے ہے کہ اس میں شریعت کی حکمت، صحیح عقائد اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس مضمون کی دلیل سورۂ آل عمران میں ہے، فرمایا:

ویعلمه الکتاب والحکمة والتوراة	اور اللہ اس کو کتاب اور حکمت،
والانجیل۔ (آل عمران۔۴۸)	تورات اور انجیل سکھائے گا۔

اس آیت میں کتاب اور حکمت کی تفسیر توراۃ اور انجیل سے کی گئی ہے۔ تورات ایک ضابطۂ شریعت تھی جس کی تعلیم ایک ایسی قوم کے لیے مناسب تھی جو ابھی عالم طفولیت میں تھی۔ اس کی ذہنی و قلبی استعداد اس سے زیادہ کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو ان کو انجیل عطا کی گئی جس کے متعلق خود انھوں نے یہ وضاحت کر دی کہ یہ صحیفۂ حکمت ہے:

لما جاء عیسیٰ بالبینات قال	جب عیسیٰ کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو
قد جئتکم بالحکمة۔	اس نے دعوت دی کہ میں تمھارے پاس
(الزخرف ۶۳)	حکمت لے کر آیا ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تعلیم حکمت کے لیے تمثیلات کے اسلوب کا سہارا لیا تاہم اس کی تعلیم بھی ادھوری تھی کیونکہ بنی اسرائیل کی ذہنی استعداد ابھی تک کامل حکمت کے تحمل کے لائق نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم کو یہ واضح پیغام دیا کہ مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں لیکن تم ان سب کا تحمل نہ کر سکو گے۔ لہٰذا اب میں جاتا ہوں اور میرے بعد جو آئے گا وہ تمھیں ان باتوں کی تعلیم بھی دے گا جن کی تعلیم میں تمھیں نہ دے سکا۔ یہ بعد میں آنے والے محمد رسول اللہؐ تھے اور آپ کے پاس وہ صحیفۂ ہدایت تھا جو ضابطۂ شریعت اور حکمت دین دونوں کا جامع ہے۔ اس میں ایک طرف حلال وحرام کی تمام حدود نہایت واضح اور متعین ہیں تو دوسری طرف یہ ایک عمیق فلسفہ اور گہری حکمت بھی رکھتا ہے۔ مولانا فراہیؒ کے نزدیک کتاب و حکمت کے الفاظ استعمال کرنے سے قرآن مجید کی اسی حیثیت کو واضح کرنا مقصود ہے۔

اس استدلال کی روشنی میں امام فراہیؒ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ امام شافعیؒ کی رائے خطا پر مبنی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حدیث رسولؐ نہ صرف حکمت کی حامل ہوتی ہے بلکہ قرآن کی حکمت کی وضاحت بھی

کرتی ہے۔ مولانا فراہیؒ جہاں اسلاف میں سے کسی کو تنقید کا نشانہ بنائیں تو ان کا رجحان طبع یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے حسنِ ظن کو مجروح نہ ہونے دیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام صاحب کے زمانہ میں لوگ قرآن کی تاویل غلط عقلیات کی روشنی میں کرنے لگ گئے تھے جس سے آیات کا مفہوم کہاں سے کہاں جا نکلتا تھا۔ امام صاحب نے ایسے لوگوں پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ فہم کتاب، سنتِ رسولؐ کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ سنت ہی کتاب اللہ کی تبیین کرتی ہے، ورنہ امام شافعیؒ نے اسی کتاب الرسالہ میں جہاں یہ بحث لکھی ہے، مقدمہ کتاب میں علم کو قرآن مجید کے علم پر منحصر مانا اور بتایا ہے کہ دل اگر منور ہوتا ہے تو حکمت کے نور سے منور ہوتا ہے اور یہ حکمت کتاب اللہ کے علم اور اس کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

مولانا فراہیؒ کے نزدیک انسان کی دو بنیادی صفات اس کی قوت فکر اور قوت ارادہ ہیں۔ قوت فکر کے ذریعے وہ ان نشانیوں سے استدلال کر سکتا ہے جن سے آفاق وانفس بھرے پڑے ہیں اور قوت ارادہ کی بدولت وہ خیر وسعادت کے کاموں کو اختیار کرتا ہے۔ حکمت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو غور وفکر کے ذریعے حاصل ہونے والے علم اور ارادہ کی قوتوں میں موافقت پیدا کرلے۔ حکمت کا منبع انسان کے خارج میں نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذات کے اندر اور اس کی فطرت میں ہوتا ہے۔ اس لیے حکمت کے طالب کو اپنے نفس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے حکمت کا تحمل یکبارگی نہیں ہوتا بلکہ بتدریج ہوتا ہے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک نقشہ کے مطابق کسی عمارت کی تعمیر درجہ بدرجہ مکمل ہوتی ہے۔

مولانا فراہی دل کے خشوع کو وہ دروازہ قرار دیتے ہیں جس کے راستے حکمت دل میں داخل ہوکر اس کو زندگی بخشتی ہے۔ خشوع رکھنے والے شخص کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے، اس کو پیدا کرنے والا عادل اور پاکیزہ رب ہے جب کہ انسان غلطی کا ارتکاب کرنے والا، بھٹک جانے والا اور سرکشی اختیار کرنے والا ہے۔ اس احساس سے آدمی میں خشیت پیدا ہوتی ہے، وہ خلوت وجلوت میں حدود الٰہی کی پابندی اختیار کرتا اور خواہشات نفس کی پیروی سے باز رہتا ہے۔ ان صفات سے اس کا قلب صاف اور حکمت کے نور سے مستنیر ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔

حصولِ حکمت کے لیے جو چیزیں نہایت اہم ہیں وہ ذکر الٰہی، تلاوتِ قرآن، اللہ کے بندوں پر شفقت اور ان کے لیے جذبۂ ترحم ہیں۔ قرآن حکیم حکمت کا سب سے بڑا خزانہ ہے لیکن اس کے اندر حکمت کے موتی تلاش کرنے کے لیے غور وتدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ حصولِ حکمت کی تگ و دو کے لیے انسان جو ذرائع بھی اختیار کرے لیکن مولانا فراہیؒ کے نزدیک اس کے حصول میں کامیابی اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔ حکمت اللہ تعالیٰ کی وہ عطائے خاص ہے جس کے سیکھنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

کتاب حکمۃ القرآن

مولانا فراہیؒ کی کتاب 'حکمۃ القرآن' ابھی تک طبع نہیں ہوسکی۔ اس کا غیر مرتب مسودہ موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس کو شائد چار حصوں میں لکھنا چاہتے تھے مگر کام صرف تین حصّوں پر ہو سکا۔ مسودہ کے پہلے حصہ میں حکمت کا مفہوم اور اس کی خصوصیات، حکمت اور ایمان کا تعلق، حکمت کی تعلیم اور اس کے حصول کا طریقہ پر چند فصلیں لکھی گئی ہیں۔ دوسرے حصہ میں مولانا نے واضح کیا ہے کہ قرآن حکمت کا سب سے بڑا خزانہ اور اس کا اصل منبع ہے، لیکن حکمت اس کے نظم میں پوشیدہ ہے۔ نظم قرآن تک رسائی کے لیے وسیلہ بھی حکمت ہی ہے۔ حکمت کے بغیر آدمی یا تو نظم قرآن کا انکار کردیتا ہے یا اُس سے بعد محسوس کرتا ہے۔ کتاب کے اسی حصہ میں مولانا نے واضح کیا ہے کہ ایک حکیم آدمی کی صفات کیا ہوتی ہیں۔ تیسرے حصہ میں امام فراہی دین اسلام کا نظام بیان کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا الگ نام تجویز کیا "النظام فی الدیانۃ الاسلامیۃ"۔ اس میں دین کا اندرونی نظام، مختلف اجزا کی باہمی موافقت اور خارج کے ساتھ اس کا تعلق بتایا گیا ہے۔ ان تینوں حصوں میں انھوں نے اپنے طریقہ کے مطابق بعض فصلیں تو سپردِ قلم کردیں لیکن بعض ناتمام چھوڑ دی ہیں۔